بحث و نظر

قرآن اور سائنس[1]

ڈاکٹر سید مسعود احمد

علم سائنس بار بار پیش آنے والے مشاہدات و انکشافات کو انسانی زبان میں مربوط انداز میں منتقل کرنے کا نام ہے۔ اور اصولی طور پر اپنے طریقۂ کار (Method) کے لحاظ سے مشاہدہ اور تجربہ پر مبنی ہوتا ہے۔ ان تجربات و مشاہدات کی روشنی میں سائنسداں کوئی نتیجہ (Inference) اخذ کرتا ہے۔ اس علم کی تعریف اور طریقۂ کار کی روشنی میں یہ حقیقت آغاز ہی میں طے ہو جاتی ہے کہ یہ علم عالم مشاہدہ (Phenomenal or Physical world) تک ہی محدود ہے اور مابعد الطبیعیات (Metaphysical and Naumenal world) کے حقائق سے اس کو سروکار نہیں۔ سائنس بذاتِ خود مابعد الطبیعات کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتی کیوں کہ یہ اس کے دائرہ کار اور رسائی سے باہر ہے۔

سائنس کے سلسلہ میں دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ یہ ایک نامکمل علم ہے۔ حقائق کی گہرائی تک پہنچنے کے معاملہ میں یہ ابھی تک ابتدائی مرحلہ میں ہے بے شمار سائنسی حقائق جو آج سائنس جدیدہ کے جزو لاینفک کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا ماضی قریب میں کوئی نام تک نہ جانتا تھا۔ مثال کے طور پر ایٹم (Atom) اور اس سے بھی چھوٹے ذرات (Sub atomic particles) یعنی الیکٹران، پروٹان نیوٹران وغیرہ۔ نیز بہت سی اشیاء کی خوردبینی تفاصیل سے دنیائے سائنس ابھی چند سال قبل تک نابلد تھی۔ علاوہ بریں بہت سے سائنسی کرشمے جن کا

---

[1] اس مضمون میں صرف طبیعیاتی (Physical) اور قدرتی (Natural) سائنس کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ علوم عمرانیات (Social Sciencess) اور علم نفسیات (Psychology) وغیرہ سے کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

تصور تک محال تھا آج دنیا انہیں اپنی چشم سر سے دیکھ رہی ہے۔ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں ان حقائق کی ناقابل تردید توجیہ کی جا سکے۔ اس لئے مابعد الطبعی عقائد کی نفی کرنے والے سائنسدانوں کو سائنس کی حدود کا بھی خیال رکھنا چاہئے اور اس کی عدم تکمیل کا بھی۔

یہاں سائنس اور فلسفہ کے فرق کو سمجھتے چلنا بھی ضروری ہے۔ بعض حضرات ان دونوں کو غلط ملط کر دیتے ہیں۔ ایک تو ہیں سائنسی حقائق (Scientific facts) دوسرے ہے ان کی فلسفیانہ توجیہ (Philosophical interpretation)۔ سائنسی نظریات (Scientific theories and hypotheses) سائنس کے فلسفیانہ نقطہ ہائے نظر ہیں جب سائنسی حقائق (Scientific facts) تجربات و مشاہدات سے اخذ کردہ مسلّم الثبوت حقائق (Proved facts) ہیں۔ مثال کے طور پر کھانے والا نمک (Sodium Chloride or table salt) اپنی کیمیادی ماہیت کے لحاظ سے سوڈیم اور کلورین کا مرکب ہے اور کاسٹک سوڈا اور نمک کے تیزاب (Hydrochloric acid) کے تعامل سے وجود میں آتا ہے اور یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کیوں کہ کاسٹک سوڈا اور نمک کا تیزاب جب بھی اپنے مخصوص حالات و ترتیب میں ملائے جاتے ہیں تو کھانے کا نمک لازماً بنتا ہے۔ مزید براں نمک کی کیمیاوی تحلیل کے ذریعہ سوڈیم اور کلورین کو الگ بھی کیا جا سکتا ہے گویا مثبت و منفی دونوں طریقوں سے ایک ہی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نیوٹن کا کشش ثقل کا نظریہ۔ آئن اسٹائن کا نظریۂ اضافیت۔ ہائگن کی ایتھر تھیوری۔ روشنی کی نوٹان تھیوری۔ ڈاردن کا نظریۂ ارتقاء وغیرہ تمام نظریات کی حقانیت ہنوز محتاج ثبوت ہے۔ ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی حد تک حقیقت کے قریب اور قرین قیاس ہیں۔ اور یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سائنسی نظریات میں سے ہر ایک نظریہ زمانہ کے ساتھ ساتھ ترمیم و تنسیخ کے مراحل سے گزرتا رہتا ہے۔

سائنس کسی مسئلہ کی حقیقت اصلی (Absolute reality) معلوم نہیں کرتی بلکہ اس کی معروضی تشریح کرتی ہے۔ نیز اس کے Inductive اور Deductive دونوں طریقوں میں منطق و فلسفہ کی ضرورت پیش آتی ہے۔ مزید برآں سائنس اپنی تعریف کے مطابق

تجربات و مشاہدات کو مربوط انداز میں انسانی زبان میں منتقل کرتی ہے اور اس کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ان اعداد و شمار (Datas) اور نتیجہ (Inference) کے درمیان دماغ واسطہ (Medium) کے طور پر کام کرتا ہے جس کا اپنا ایک خاص دائرہ کار اور حدود (Definite capacity and limitations) ہیں نیز اس کے نتائج اس سائنسداں کے انفرادی حالات (مثلاً نفسیاتی اور نظریاتی عوامل) اور اجتماعی ماحول (مثلاً سماجی اور سائنسی ماحول) سے متاثر ہوتے ہیں۔ اس طرح بہت سے عوامل اخذ نتیجہ (Inference) پر اثر انداز ہوتے ہیں اور نقصِ نتیجہ (Defective and imperfect inference) کا باعث ہوتے ہیں۔ ان تغیر پذیر عوامل کی وجہ سے سائنسی نظریات تو درکنار سائنسی حقائق تک میں تغیر و ترمیم عین ممکن ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ نظریات میں عقلیاتی پہلو نمایاں ہونے کی وجہ سے تغیر و ترمیم کے زیادہ امکانات ہیں جب کہ سائنسی حقائق ان سائنسی نتائج کا نام ہے جن میں عقلی یعنی فلسفیانہ پہلو کم اور تجرباتی پہلو نمایاں رہتا ہے اور کوئی بھی سائنسی نظریہ اتنا ہی قریب الحقیقت ہوگا جتنا اس میں تجرباتی پہلو اپنے نظریاتی پہلو پر غالب ہوگا[۵۲]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنسی حقیقت (Scientific fact) اس علمی دریافت کا نام ہے جس کو جاننے کے لئے مختلف مثبت و منفی تجربات و مشاہدات کے لامتناہی طریقے اختیار کرنے کے بعد صرف ایک نتیجہ ہی ممکن ہو۔ علاوہ بریں اس جواب کو اخذ کرنے کے لئے عقل و تخیل کا بالکل دخل نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ موخر الذکر شرط پوری ہونا ناممکن ہے جس کی وجہ سے سائنس اپنی تمام تر خوبیوں کے باوجود حرفِ آخر نہیں ہو سکتی۔

سائنس کے بعض علمبرداروں کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ اپنے سماجی اور نفسیاتی ماحول سے بلند ہو کر حقائق کی جستجو کرتے ہیں۔ مگر یہ مفروضہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ غور کرنے سے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ہر شعبہ کی علمی ایجاد (Invention) و تحقیق (Investigation)

---

۵۲ واضح رہے کہ مابعد الطبیعات کے حقائق کے سلسلہ میں اس کلیہ کا استعمال کرنا صحیح نہیں ہے کیونکہ یہاں مادی تجربات سرے سے کئے ہی نہیں جا سکتے اس لئے اس عالم طبیعی کے اصول و قوانین (Physical world) کو عالم مابعد الطبیعات (Metaphysical or Supra sensary-world) پر منطبق کرنا نادانی ہے۔

جہاں ایک طرف دنیا کو نئی جہات اور نئی روشنی فراہم کرتی ہے تو دوسری طرف اس محقق کے ذہنی اخلاقی اور نظریاتی ڈھانچہ کی خاموش تبلیغ کا سامان بھی فراہم کرتی ہے۔ اس تحقیق کے عوامل و محرکات اور اس کی تشریح میں ان نظریات کی بازگشت صاف محسوس ہوتی ہے جو اس ماحول میں جاری و ساری ہوتے ہیں اور خصوصاً جن نظریات سے محقق متاثر ہوتا ہے۔ لہٰذا سائنسی نظریات کے بارے میں یہ سمجھنا کہ یہ ہر حال میں فطری حقائق کی ترجمانی کرتے ہیں کوتاہ علمی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیشتر نظریات زمانہ کی پیداوار ہوتے ہیں جو زمانی حالات و نظریات کے ساتھ بدلتے بھی رہتے ہیں۔ صرف وہی نظریات حقائق اصلی کی حدود کو چھو سکتے ہیں جن میں زمانی نظریات سے بلند ہو کر یا ان کا کم سے کم سہارا لے کر سائنسی تجربات و مشاہدات کی تشریح کی گئی ہو اور جس تحقیق کا محرک مفید مطلب نظریہ کے لئے راہ ہموار کرنا نہ ہو۔ دور جدید کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ بیشتر مفکرین مشاہدہ و تجربہ سے قبل ہی اپنے ذہن میں کوئی خاکہ بنا لیتے ہیں۔ بلاشبہ (Inductive method) میں بھی یہ خاکہ بنایا جاتا ہے۔ مگر یہ خاکہ ان تجرباتی اعداد و شمار (Datas) کی روشنی میں بنایا جاتا ہے نہ کہ اعداد و شمار اور تجربات و مشاہدات سے قبل۔

دوسرا مسئلہ سائنس کے معاملہ میں یہ ہے کہ موجودہ سائنسدانوں کا معتدبہ طبقہ اپنی نجی زندگی میں مادہ پرست واقع ہوا ہے اس لئے مادیت کے لئے نرم گوشہ (Biased) رکھنا کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ مادیت کے لئے جھکاؤ کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ اولاً سائنس اپنی تعریف کے مطابق اسرار و رموز کی مادی تشریح کا نام ہے کیونکہ وہ حسیاتی مظاہر (Physical and perceptible phenomena) ہی کی تشریح کرتی ہے۔ دوسری بڑی وجہ اس کی سولھویں سترھویں صدیوں کی دردناک تاریخ ہے جو کلیسا اور مذہب کی تضحیک و انکار پر منتج ہوئی۔ جس کے نتیجہ میں دکارتے (Descarte) اور نیوٹن کا میکانیکی تصور کائنات ابھرا اور ایک قدم آگے بڑھ کر کہنے والوں نے یہاں تک کہا کہ کائنات کے ہر مظہر اور اس کی تمام حقیقتوں کو ناپا اور تولا (Measurablity) جا سکتا ہے۔ اور بات یہاں تک پہنچی کہ سائنس کی حیثیت محض علم کی ایک شاخ (Field of Knowledge) کی نہ رہی بلکہ اس کو طریقہ حیات (Way of life) تک کا درجہ دے دیا گیا جس کو سائنٹفک طریقۂ زندگی کہا جاتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جدید سائنس کی نت نئی اور عجوبہ روزگار ایجادات نے عام انسانوں کے ذہنوں پر جو اثر ڈالا ہے اس سے کسی دوسرے علم کو کوئی نسبت نہیں ہے اس نے اپنا ایک مستقل تصور کائنات (World view) فراہم کیا ہے جس میں انسان کی نظریں کلیتاً سے ماوراء دیکھ ہی نہیں سکتیں اور اس کی عقل غیر حسیاتی حقائق کو معقول (Rational) تسلیم ہی نہیں کرتی۔ لامحدود (Unmeasurable) اور غیر حسیاتی خدا کا تصور اس تصور کائنات کی رو سے "غیر سائنٹفک" قرار پاتا ہے۔

اب ذرا مادی سائنس کی ان خامیوں پر غور فرمائیے جن کی وجہ سے یہ انسانیت کے اہم مسائل حل کرنے سے قاصر ہے۔ اس سلسلہ میں بنیادی بات یہ ہے کہ سائنس اپنی تعریف کی رو سے انسان کے مادی وجود ہی سے بحث کرتی ہے۔ اس کے اخلاقی، روحانی اور معاشرتی پہلوؤں سے اسے کوئی سروکار ہی نہیں۔ گویا انسان ہر طرح کے احساسات سے عاری محض گوشت پوست کا ایک لوتھڑا ہے یا پھر ایک متحرک مشین جو کام کرنے کے لئے صرف ایندھن اور ٹوٹ پھوٹ پر مرمت ہی چاہتی ہو۔

اگر انسانیت کے مسائل اتنے ہی ہوتے کہ وہ جسمانی نشو ونما اور بقا کو کیسے قائم رکھ سکے تب تو بیشک سائنس میں ہی مسائل انسانیت کا حل مضمر ہو سکتا تھا۔ مگر انسان تو سماجی و سیاسی مسائل بھی رکھتا ہے اور اخلاقی و روحانی بھی۔ اور ان مسائل کے حل کے لئے بہر حال کسی اور طرف بھی رجوع کرنا پڑے گا۔

کہا جا سکتا ہے کہ جسمانی وجود کے مسائل ہی سہی سائنس انسان کے تمام مادی مسائل حل کر دے گی۔ مگر یہ بھی محض ایک مفروضہ ہی ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان بذاتِ خود ایک اکائی ہے۔ اس کا مادی وجود روحانی اخلاقی اور معاشرتی پہلوؤں سے متاثر ہوتا ہے اور ہر ایک جزو وجود دوسرے پر اثر انداز ہوتا ہے۔ بلکہ انسان کے سلسلہ میں روحانی وجود ہی اس کا اصل الوجود معلوم ہوتا ہے جس کے سبب دیگر مسائل سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے۔ وگرنہ جانوروں کی دنیا میں جن کا واحد مقصد جسمانی بقا و نشو ونما ہوتا ہے، کوئی سیاسی، سماجی اخلاقی اور غذائی مسئلہ بھی نہیں ابھرتا اور جانور انسان کی نسبت نہایت مضبوط اور طاقتور ہوتے ہیں یہی

وجہ ہے کہ اگر ایک شخص روحانی طور پر مطمئن نہیں ہے تو سائنس جسمانی طور پر اس کو صحت مند نہیں بنا سکتی۔ اسی طرح اخلاقی طور پر گرا ہوا انسان روحانی طور پر مطمئن نہیں ہو سکتا۔ مزید برآں معاشرتی مسائل حل کئے بغیر نہ انسان نفسیاتی طور پر مطمئن ہو سکتا ہے اور نہ جسمانی طور پر تندرست و توانا رہ سکتا ہے۔

فرد معاشرہ کی اکائی بیشک ہے لیکن یہ بالکل سادہ اکائی نہیں ہے کہ ریاضی کے اصولوں کے مطابق براہ راست (Direct quantitationed simple measurability) نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہو۔ بلکہ یہاں ایک اور ایک مل کر بے شمار سماجی، معاشی، اخلاقی اور سیاسی مسائل کو جنم دیتے ہیں جن کا حل موجودہ سماجی، معاشی اور سیاسی سائنسوں (Social Science Economics and political Science) میں نہیں مل سکتا جن کی بنیاد ایک اور ایک دو کے اصول پر رکھی گئی ہو۔

سائنس میں ان مسائل کے حل کی صلاحیت ہی نہیں ہے کیوں کہ وہ اپنی تعریف کے مطابق ہر مسئلہ کا سطحی اور معروضی تجزیہ (Third order of abstraction) کرتی ہے جب کہ مذہب ہر مسئلہ کی چھپی حقیقت (Zero order of abstraction) تک جاتا ہے۔

موجودہ معاشرتی اور اجتماعی سائنسوں کے وجود کا محرک قدرتی سائنسوں (Natural and pure sciences) کی خیرہ کن ترقی ہے۔ بلکہ اصل بات تو یہ ہے کہ جدید مادی سائنس نے ہر شعبہ علم پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ لہٰذا معاشیات کے ماہرین اسی میں اپنی خیر سمجھتے ہیں کہ سائنسی طریقۂ کار (Scientific methods) کو اختیار کرلیں۔ سماجیات اور سیاسیات کا بھی یہی حال ہے اور انھوں نے ان نام نہاد سائنسی طریقہ ہائے کار کو اپنے علوم میں داخل کر کے ان کو سماجی سائنس اور سیاسی سائنس بنا دیا۔ سائنس کی اس نام نہاد برتری کی وجہ سے اور اس کے دوسرے علوم پر حاوی ہونے کی وجہ سے نیز سائنس جدید کے مادی اور میکانکی تصور کائنات (Mechanical world view) سے مرعوب ہو کر آج کے سائنسداں بالخصوص اور عوام بالعموم اس خام خیالی کو عقیدت پسندی

اور آزادیٔ فکر سمجھ بیٹھے ہیں کہ مابعد الطبیعی عوامل کو کالعدم قرار دیں اور مذہب اور خالقِ کل کا انکار کر دیں۔

سائنس کی ایک اور بنیادی خامی یہ ہے کہ وہ اشیاء کو ٹکڑوں میں تقسیم کر کے ان کے مختلف اجزاء کا الگ الگ تجزیہ کرتی ہے۔ یہاں تک کہ انسان کو بھی ایک ایسی مشین سمجھتی ہے کہ گویا اس کے مختلف اجزاء میں نیز دو افراد میں باہم کوئی تعامل نہیں۔ سائنسداں اس موقع پر علم کیمیا کے اس فطری اصول کو بھول جاتے ہیں کہ دو عناصر دیر تک کسی مخصوص حالت میں ایک ساتھ رہیں تو ایک مرکب کا وجود ہوتا ہے جو اپنی انفرادی خصوصیات میں اپنے بنیادی (Parent) عناصر سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ لہٰذا اشیاء کا محض منتشر اور سطحی تجزیہ حقیقت سے قریب کرنے کی جگہ دور کرتا چلا جاتا ہے۔

اب ذرا قرآن کے بارے میں غور کریں۔ قرآن انسانوں کی ہدایت کے لئے ایک مکمل کتاب ہے۔ اس کا موضوع اور مخاطب انسان ہے۔ قرآن میں انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ البتہ قرآن خاص طور سے انسان کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں پر تفصیل سے بحث کرتا ہے۔ کیوں کہ اخلاقی اور روحانی اقدار کے صحیح معیارات اور ان کی نشاندہی انسانی عقل و شعور کے بس کی بات نہیں۔ انسان اس ناقص عقل و شعور سے انسانیت کی حقیقی فلاح کے لئے کوئی مکمل و متوازن دستورِ زندگی اور حقیقی نظامِ حیات مرتب نہیں کر سکتا اس کے لئے تو کسی برتر ہستی کی طرف سے براہِ راست علم پہنچنا چاہیئے۔ قرآن اس حقیقت کو مندرجہ ذیل آیت میں اس طرح پیش کرتا ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ	اللہ تعالیٰ ہی کے ذمہ صحیح راستہ دکھانا ہے
وَمِنْهَا جَآئِرٌ	(خصوصاً جبکہ دوسرے (گمراہ کن) راستے
(النحل: ۹)	بھی ہیں۔

قرآن کی بنیاد خالقِ کائنات کے اثبات اور توحید پر قائم ہے جب کہ یہ دونوں عقائد سائنس کی رسائی سے باہر ہیں۔ اس لئے کہ سائنس مادہ اور توانائی کی دریافت سے آگے نہیں جا سکتی۔ جب کہ خالقِ کائنات قرآن کی رو سے نہ تو مادہ ہے اور نہ توانائی۔

لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ (شوریٰ:۱۱) اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔

قرآن کی رو سے یہ پوری کائنات ایک عظیم اور مربوط نظام کے تحت وجود پذیر ہے۔ اس کے ذیلی نظام ایک دوسرے سے اس طرح باہم دگر منظم و مربوط ہیں کہ نہ صرف اپنی انفرادی حیثیت کو باقی رکھتے ہیں بلکہ ایک بڑے نظام کی تشکیل و تکمیل میں حصہ بھی لیتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ قرآن کی رو سے نہ صرف کائنات کے مختلف اجزا بلکہ شعوری (انسان) اور غیر شعوری مخلوق (اجرام سماوی اور ہوا پانی وغیرہ) کے درمیان تعامل و تعاون پایا جاتا ہے۔ بنی نوع انسان کے کسی بھی معاملہ یا مسئلہ کو جب قرآن پیش کرتا ہے تو وہ اسی تصور وحدت (وحدت کائنات و انسان) اور مندرجہ بالا ربط و نظم کو پیش نظر رکھتا ہے۔ قرآن کا نظریۂ توحید کل کائنات کو پہلے چند وحدتوں میں تقسیم کرتا ہے اور پھر ان تمام وحدتوں (مثلاً وحدتِ انسانیت و وحدت کائنات وغیرہ) کو ایک مکمل دیکتا وحدت میں پرو دیتا ہے۔ یہاں مختلف وحدتوں مثلاً وحدت انسانیت وحدت کائنات اور وحدتِ الٰہ میں ایک مکمل اور بہترین تعامل و تعاون ہے۔ یہاں خالق و مخلوق کے درمیان کوئی نزاع و کشمکش نہیں۔ انفرادی اور اجتماعی مسئلہ کی کوئی قید نہیں، ماحول و حالات کی کوئی تخصیص نہیں۔

قرآن کی رو سے مسائل مادی ہوں یا روحانی۔ انفرادی ہوں یا اجتماعی۔ سیاسی ہوں یا معاشی۔ عارضی ہوں یا مستقل۔ ہر مسئلہ خدا کے انکار اور آخرت میں جواب دہی سے بے نیازی نیز من مانے اصولوں پر چلنے سے پیدا ہوتا ہے۔ توحید، رسالت اور آخرت کے عقائد اس شاہ کلید کی حیثیت رکھتے ہیں جن سے ہر مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ خدا سے کمزور تعلق کی وجہ سے انسان اور انسان کے درمیان نیز انسان اور کائنات کے درمیان عدم تعاون اور عدم توازن پیدا ہوتا ہے۔ جس کو قرآن "فساد فی الارض" سے موسوم کرتا ہے۔ قرآن کا یہ توحیدی نقطۂ نظر کلی نقطۂ نظر (Systems approach) کو بھی پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

قرآن کے سلسلہ میں اس حقیقت کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے کہ قرآن کریم سائنس کی کتاب نہیں ہے کہ جس میں سائنسی باریکیوں کو پیش کیا جاتا۔ نہ اس کا مقصد نزول سائنسی حقائق کو پیش کرنا ہے بلکہ اس کا مقصد تو ان حقائق کا انکشاف ہے جو انسانی شعور کی پہنچ سے ماوراء ہیں اور یہ

بات سراسر معقول ہے کہ سائنسی حقائق کے کسبی علوم ہونے کی وجہ سے یعنی ان انکشافات کے انسانی عقل و تجربہ کی رسائی میں ہونے کی وجہ سے نہ ان کی تفصیل بیان کرنے کی ضرورت تھی اور نہ ان سائنسی حقائق کو جزو عقیدہ ٹھہرانا ضروری تھا۔ بلکہ تفصیل کے محتاج اور اہمیت و مرکزیت کے حامل وہ حقائق ہونے چاہئے تھے جو انسانی حواس اور اس کے کسبی علوم سے ماوراء ہوں اور جن کے بغیر دوسرے تمام کسبی علوم بھی ناقص رہتے ہوں۔ مزید برآں جو انسانی فلاح کے لئے بھی ناگزیر ہوں۔ کیوں کہ تمام سائنسی تفصیلات کو شامل کرکے قرآن ایک کتاب ہدایت نہ رہ پاتا بلکہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہوتا جو عام لوگوں کی پہنچ سے بالاتر ہوتا۔ نیز انسان کی وہ صلاحیتیں سرد پڑ جاتیں جن کے ذریعہ سے وہ آج تسخیر کائنات کے خواب دیکھ رہا ہے اور ستاروں کی بلندی اور سمندر کی گہرائیوں کو محض اشاروں سے طے کر رہا ہے اور قرآن کے مطابق اشرف المخلوقات کہلائے جانے کا مادی طور سے بھی مستحق ہے۔ اس کے باوجود وہ حقیقی طور پر اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق تبھی ہو سکتا ہے جب کہ اپنی اشرفیت، اپنی عزت و شرافت، اپنی بزرگی و برتری اخلاقی طور پر بھی ثابت کردے اور قرآن کا یہی مقصد ہے کہ انسان حقیقی طور پر خود کو اشرف المخلوقات ثابت کردے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا اصل اہمیت غیر کسبی علوم کی ہے۔ اسی لئے قرآن حکیم کائناتی مظاہر پر مبنی آیات میں کبھی کبھی مبہم اور ذو معنی الفاظ استعمال کرتا ہے۔ تاکہ ہر زمانہ کے کافرین و مشرکین ان غیر اہم امور میں الجھ کر ہدایت اختیار کرنے میں قباحت و تنگی محسوس نہ کریں اور اعتراض و انکار کی کوئی علمی وجہ باقی نہ رہے یہی وجہ ہے کہ ان مبہم اور ذو معنی آیات ہی کے طفیل ہر زمانہ کے پڑھے لکھے اور اُس زمانہ کی سائنس سے مرعوب لوگ بھی قرآن کے ذریعہ ہدایت حاصل کرتے رہے ہیں۔ یہ ہے قرآن کا وہ اعجاز جس کی وجہ سے قرآن ایک دائمی کتاب ہدایت بن گئی ہے۔

اب آیئے قرآن اور سائنس میں مناسبت کے پہلو بھی تلاش کریں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور سائنس دونوں کائنات کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کے لئے منطقی اور عقلی استدلال کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر قرآن کائناتی

حقائق و مظاہر پر غور و فکر کرنے اور ان کی تحقیق و جستجو کے لئے ابھارتا ہے۔ بالفاظ دیگر قرآن سائنسی تحقیقات کے لئے راہیں ہموار کرتا ہے۔ قرآن فطرت انسانی میں پوشیدہ "جستجوئے کائنات" "جستجوئے حقیقت" یا محتاط الفاظ میں "جستجوئے مطلق" میں مہمیز لگا کر انسان کو تسخیر کائنات کے لئے تیار کرتا ہے لہٰذا اس حیثیت سے قرآن اور سائنس کا تعلق حرکت اور فعل کا ہے۔ قرآن انسان کو حرکت میں لاتا ہے اور سائنس اس حرکت کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے۔

قرآن و سائنس کی مناسبت کا دوسرا پہلو ان کا نظریہ معنویت و مقصدیت (Ration-ality) ہے۔ سائنسداں بھی ہر تحقیق سے پہلے ہی یہ فرض کر لیتا ہے کہ فلاں مظہر قدرت میں کوئی معنویت ہے اور ہر مظہر کا کوئی مقصد (Function) ہے۔ مگر قرآن جس معنویت و مقصدیت کی طرف انسان کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہے وہ اس مظہر قدرت کی آخری حقیقت (Ultimate reality) ہے یعنی اسباب و علل کا مقصد اور اعلیٰ ترین اخلاقی مقصد۔ جب کہ سائنس اس معنویت کے پہلے قدم سے آگے نہیں جاتی یعنی کسی شے کے مختلف مادی عناصر کی تشریح اور زیادہ سے زیادہ ان عناصر کے درمیان تعامل کی سطحی تشریح۔

قرآن کی رو سے انسان اس کائنات میں اشرف المخلوقات قرار پاتا ہے۔ وہ انسان کو غور و فکر اور تحقیق و تجسس کے ذریعہ خالق کائنات اور یوم جزا کے اثبات کے لئے تیار کرتا ہے۔ تسخیر کائنات کے لئے ابھارتا ہے یہاں تک کہ اس کی رو سے مشاہداتی دنیا کی کوئی شے ناممکنات کی حد میں نہیں آتی مگر اس تسخیر کائنات کے محرک کے پس پردہ انسانی فرد و سماج کے استحصال یا کائنات کے استحصال کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا۔ قرآن میں آفاق و انفس پر غور و تدبر کی دعوت دینے والی آیات احکامات و قوانین کی آیات سے کئی گنا زیادہ ہیں۔

اس سلسلہ کی صرف دو آیات ملاحظہ ہوں :-

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ	آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں
وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ	ہیں جن پر سے وہ یوں ہی گزر جاتے
عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ٥ (یوسف ۱۰۵)	(اور ان پر غور و فکر نہیں کرتے)
وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ ٥	یقین کرنے والوں کے لئے زمین

وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ○ میں نشانیاں (ہی نشانیاں) ہیں اور خود ان کے نفس (وجود ذات) میں پس کیا پھر بھی تم بصیرت حاصل نہیں کرتے۔
(الذاریات ۲۰، ۲۱)

قرآن کی اسی دعوتِ غور وفکر کے نتیجہ میں سائنس کے میدان میں تیز رفتاری آئی اور مسلم مفکرین و سائنسدانوں نے قرآن سے تحریک، حاصل کر کے اس سائنسی انقلاب، کا دروازہ کھول دیا جس کو ملحدین آج اپنا آلۂ کار بنائے ہوئے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ سائنس کا ارتقاء قرآن کی دعوتِ تحقیق و تجسس کا نتیجہ اور یورپ کا سائنسی انقلاب قرآن کے علمبرداروں اور اس کی تحریک کا مرہون منت ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ سترہویں صدی کا سائنسی انقلاب قرآنی اصولوں کے مطابق ہوا۔ بات یہ ہے کہ اسلام ایک تحریک ہے قرآن ہر شعبہ علم کی ترقی میں مزاحم ہونے کے بجائے اس میں مہمیز لگاتا ہے۔ قرآن ایک "کل" سے عبارت ہے اس کے کسی جزء کو الگ کرنے سے حقیقی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یہ غلطی مسلم سائنسدانوں سے بھی شروع ہی سے سرزد ہوتی رہی ہے کہ سائنس کو قرآن کے سانچے میں ڈھالنے کی کبھی منظم کوشش نہ کی گئی۔ اور سائنس کو باطل کے شکنجۂ اقتدار میں ہی رہنے دیا گیا۔

اب جب کہ سائنس اور قرآن کا مختصر سا موازنہ کیا جا چکا ہے بہتر ہو گا کہ موجودہ سائنس کی سمت سفر بھی متعین کر لی جائے جس کی باگ ڈور اکثر ملحد سائنسدانوں کے ہاتھوں میں ہے۔ یوں تو علم سائنس کا اخلاقیات سے کوئی علمی تعلق نہیں ہے۔ البتہ تجربہ کی روشنی میں سائنسدانوں کے لئے اخلاقی پابندی کے بغیر چارۂ کار نہیں۔ قرآن اس پابندی کی پرزور وکالت کرتا ہے بلکہ بہت سی مستقل اخلاقی اقدار پیش کرتا ہے۔ قرآن کی رو سے اخلاقی پابندیوں کا انکار خدا کے حضور جوابدہی کے انکار کے مترادف ہے۔ لہٰذا اس مسئلہ پر بحث کے لئے سائنسی مسائل میں خدا کی ہستی و وحدانیت کا اعتقاد زیر بحث لانا ضروری ہے۔

ملحد سائنسدانوں کی نظر میں دنیا کی ہر چیز محض اتفاق سے وجود میں آ گئی۔ اور بہت سے اتفاقات نے طویل زمانہ میں ماحول[۳۴] سے اثر لے کر انسانی تخلیق و تسویہ کا یہ عظیم کارنامہ انجام

---

[۳۴] ماحول (Environment) کسی شئے کے ارد گرد مادہ اور توانائی کے اجزاء کا نام ہے جو اس (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

دیا یوں کہنا چاہئے کہ اتفاق ہی اس پوری دنیا کا اور خود انسان کا خالق ہے۔

اتفاق اور زمانہ کی بحث طویل ہے البتہ ان سائنس دانوں کے نزدیک یہ تسلیم شدہ ہے کہ اتفاق اور زمانہ دونوں عقل سے عاری اندھے عوامل ہیں جو نہ مادہ ہیں اور نہ توانائی (دراصل دونوں معروضی اصطلاحیں ہیں ان کی اصل حقیقت کوئی نہیں جانتا) یہ دونوں غیر مادی اور توانائی سے خالی عوامل اس انسان کے خالق ہیں جو مادہ سے وجود میں آتا ہے، توانائی کی مختلف قسموں پر اس کی زندگی کا انحصار ہے اور اتنی عظیم عقل سے مزین ہے کہ چاہے تمام خداؤں کا انکار کر دے اور چاہے تو اس اندھے بہرے اور عقل سے عاری "خالق" کو تسلیم کرکے اپنی ہٹ دھرمی یا اپنی عدم عقلیت کا ثبوت پیش کر دے۔

حقیقت یہ ہے کہ سائنسدانوں کا اپنی تحقیقات اور نظریات کے سلسلہ میں خالق کائنات سے بیزاری کا رویہ کسی طرح بھی سائنٹفک نہیں ہو سکتا۔ سائنس کا سب سے پہلا اصول اور ہر تحقیق کا محرک یہ نکتہ ہے کہ ہر کائناتی منظہر (Phenomenon) کی ایک علت (Cause) ہے۔ ثانیاً ہر عمل کے وجود پذیر ہونے کے لئے طاقت (Force) اور توانائی (Energy) کی ضرورت ہے۔ ثالثاً کوئی عمل پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتا جب تک کہ مادہ اور توانائی کا تعامل (Interaction) نہ ہو۔

چنانچہ اگر یہ سوال ہو کہ دنیا میں انسان کا وجود کیسے ہوا؟ اس سوال کے متعدد جواب ممکن ہیں۔ لیکن اکثر فلاسفہ نے اس سوال کے دو جواب دیئے ہیں۔

ایک یہ کہ محض اتفاقات نے طویل زمانہ اور ماحول کی سازگاری کے سبب غیر نامیاتی (Non-living) سالموں کو ایک خلیہ (Cell) میں تبدیل کیا اور یہ واحد الخلیہ جاندار (Single cellular living organism) ان عوامل کے ذریعہ مزید

(بقیہ حاشیہ)

شئے کو متاثر کرتے ہوں۔ مثلاً ہوا، حرارت، پانی، روشنی اور مختلف مادی ذرات۔ اس لحاظ سے خود ماحول بھی اتفاق و زمانہ کا ہی پیدا کردہ ہے۔ لہٰذا ملحدین کے خدا کی تعریف میں ماحول کی بھی ضرورت نہیں۔

ارتقاء کرکے آج انسانی شکل میں پایا جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ کسی مافوق الفطرت ہستی نے اپنے حکیمانہ پلان کے تحت انسان کو وجود بخشا۔ اس حکیمانہ پلان کے ضمن میں مخصوص ماحول کا وجود، اس کی سازگاری، طویل مدت اور نہ جانے کتنے عوامل آجاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ان دونوں رایوں میں سے کوئی بھی رائے غیر سائنٹفک نہیں ہے۔ کیوں کہ سائنس تو اس پلان کی تفصیل سے بحث کرتی ہے۔ اسے اس بات سے غرض نہیں کہ اس پلان کو وجود میں لانے والا کوئی ہے یا نہیں۔ جب کہ پہلا نظریہ خدا کے وجود کی نفی کرتا ہے اور دوسرا اپنے ساتھ خدا کے وجود کا عقیدہ رکھتا ہے۔

ان جوابوں میں سے ایک تو خدا کے قوانینِ فطرت کی سائنسی تفصیل معلوم کرنے کے مترادف ہے اور دوسرا سائنسی تفصیل تو بیشک دیتا ہے مگر "اتفاقات" (Chances) کا جھانسہ دے کر سائنسی تحقیقات کی تحریک و عامل (Scientific incentive & motivation) یعنی جستجوئے مطلق (curiosity & human urge of creativity) کو بھی ملیامیٹ کرنے کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً کوئی بچہ اپنے باپ سے پوچھے کہ ابا جان! فلاں چیز کیسے بنی؟ اور باپ یہ جواب دے کہ مجھے معلوم نہیں یا بالفاظِ دیگر وہ یہ کہے کہ بیٹا! وہ محض ایک اتفاق تھا۔ تو وہ اس کے جذبۂ تحقیق کو بھی ختم کرتا ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ کیا اس سوال کا حقیقی حل ممکن ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب سائنس جدید کے بس کی بات نہیں کیوں کہ انسان ماضی ہی میں عالم وجود میں آگیا اور اس سلسلہ کی کڑیوں کے بارے میں متفقہ رائے ہونا اس لئے بھی محال ہے کیوں کہ سائنس دانوں ہی کے مطابق اب دنیا کا وہ ماحول نہیں ہے۔ جو تخلیقِ حیات کے وقت تھا۔ آثارِ قدیمہ کے ذریعہ ظن و گمان سے اوپر اٹھ کر کوئی ٹھوس سائنٹفک حقیقت پیش نہیں کی جاسکتی۔ مزید برآں انسان کی اتنی عمر اور وسائل بھی نہیں ہیں کہ اس مسئلہ کے شایانِ شان تجربات کر سکے۔ بہ فرضِ محال اگر تجربات سے کوئی بات پایۂ ثبوت کو پہنچ بھی جاتی ہے تب بھی اس میں یہ امکان بہرحال باقی رہتا ہے کہ اس وقت یہ عمل ظہور پذیر نہ ہوا ہو۔ خصوصاً جب کہ ماحول لگاتار بدل رہا

ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ ایسے مسائل کا ناقابل تردید جواب سائنسِ جدید فراہم نہیں کرسکتی۔ چنانچہ اس سوال کا نظریاتی اور فلسفیانہ جواب ہی دیا جاتا رہا ہے جو قیاس و گمان کے سوا کچھ نہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر کر دینا بھی مناسب رہے گا کہ قرآن انسان کی پیدائش کے مختلف ارتقائی مراحل کو تو بیان کرتا ہے اور اس کے لئے اس نے مختلف الفاظ بھی استعمال کئے ہیں۔ مثلاً طِین۔ طین لَازِب، حَمَإٍ مَّسْنُونٍ، تُراب، صَلْصَالٍ کَالْفَخَّار۔ ماءٍ مَّهِین، وغیرہ اصل سوال یہ ہے کہ کیا انسان کسی دوسری مخلوق کی ترقی یافتہ شکل ہے یا نہیں۔ نہ تو قرآن اس کا قائل ہے اور نہ سائنس اس کا قطعی جواب دیتی ہے۔

مختصر یہ کہ کسی مسئلہ کی ایسی مادی تعبیر جس کے ذریعہ خدا کا انکار مقصود ہو۔ یا جہاں خدا کی ضرورت ہی نہ رہ جاتی ہو۔ سائنس اور عیسائیت کی سولہویں صدی کی کشمکش کے بعد مذہب دشمنی کی شکل میں پیدا ہوئی ہے اور آج مذہب دشمن اور خدا بیزاری کے جراثیم موجودہ سائنسی لٹریچر میں اتنے سرایت کر گئے ہیں کہ موجودہ سائنسداں بھی شعوری اور لاشعوری طور پر اس سے متاثر بلکہ مرعوب ہیں۔

اگر یہ تمام خرابیاں موجودہ سائنسی نظریات سے دور کردی جائیں تو سائنس اور قرآن کے درمیان کوئی ناقابلِ حل اختلاف نہ رہے کیوں کہ قرآن حقائق کا سرچشمہ ہے لہٰذا سائنسی مسائل کی تشریحات میں بھی ان حقائق کی عکاسی ہے۔ اور سائنس حقیقت تک پہنچنے کے لئے راہ فراہم کرتی ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ جہاں کہیں قرآن و سائنس کے بیانات میں تضاد محسوس ہو تو اس کی دو وجہیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ ان بیانات کی تشریح ہی میں نقص ہو یعنی اس آیت کی صحیح تفسیر نہ کی گئی ہو جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے عام طور پر مفسرین اپنے اپنے زمانہ کے سائنسی نظریات سے استفادہ کر کے قرآن کے متعلقہ بیانات کی تفسیر و تشریح کرتے رہے ہیں اور جب یہ نظریات ہی رد ہو جاتے ہیں تو اس بنیاد پر جو تفسیر کی گئی ہے اس پر اعتراض کا پہلو نکل آتا ہے۔ دوسری وجہ ہے دور جدید کی سائنسی ترقی کے باوجود بہت سے نظریات کا حقیقت سے دور ہونا۔ آج بھی جس مفروضہ کو سائنس داں قریب الحقیقت بلکہ عین حقیقت

(Scientific Facts) سمجھتے ہیں مزید تجربات و مشاہدات کے بعد اس کی ترمیم بھی ہو سکتی ہے اور تنسیخ بھی۔ لہٰذا کسی طرح بھی قرآن حکیم کی حقانیت پر حرف نہیں آتا۔

ان دونوں وجوہات کے علاوہ، جن کی ضرب بھی خود سائنس ہی پر پڑتی ہے، کسی خالی الذہن اور غیر متعصب شخص کو قرآن مجید پر انگلی اٹھانے کی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن اور سائنس جدید کے اختلاف کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ قرآن ان انکشافات کو بھی جن کو خالص سائنسی مسائل کہا جاتا ہے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کے ساتھ لطیف انداز میں جمع کر کے پیش کرتا ہے جب کہ سائنس جدید ان اخلاقی اور روحانی پہلوؤں کو نکال کر منتشر انداز میں صرف اس مسئلہ کی مادی تعبیر ہی پیش کرتی ہے۔ بیشتر سائنسدانوں کی اخلاقی اقدار سے بیزاری سائنسی تحقیقات کا وہ رخ متعین کرتی ہے جس سے دنیائے انسانیت تباہی کے مہیب غار کی طرف گامزن ہے۔

دراصل حقیقی سائنسداں پردۂ راز میں چھپے حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے، مسائل کی گتھیوں کو سلجھاتا ہے۔ ان کی جانچ پرکھ کرتا ہے اور غور و خوض کے بعد اس کو بھلائی کے لئے استعمال ہونا چاہئے۔ یہی سائنس کا اخلاقی پہلو ہے۔ آج انسانیت کو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ سائنسی تحقیقات کا ایسا رخ ہو کہ مادی فلاح کے ساتھ اخلاقی و روحانی فلاح کی منزل بھی قریب سے قریب تر ہوتی جائے۔ ورنہ ایٹمی اور نیوکلیر ہتھیاروں کی دوڑ، مصنوعیات کا بے تحاشہ استعمال، مصنوعی جانداروں کی صنعت (Artificial living chimeras) صنعتی انقلاب سے پیدا شدہ آلودگی (Pollution) سائنس کے ذریعہ فرد اور معاشرہ کا استحصال اور سیکڑوں مہلک ہتھیاروں کی صنعت و تجارت اور بے شمار پرخطر سائنسی تحقیقات و ایجادات دنیا کو اس منزل کی طرف لے جا رہے ہیں جن کا نتیجہ مکمل تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

مزید برآں سائنس جدید کے اس غلط رخ کے نتیجہ میں تعیش، آرام طلبی، کاہلی، قوت مدافعت کی کمی، جرائم کی کثرت اور ان کے نت نئے طریقوں اور ہتھیاروں نے انسانوں کو جسمانی اور اخلاقی دونوں حیثیتوں سے دیوالیہ بنا دیا ہے اور ان میں مستقل خوف و ہراس کا ماحول پیدا کر دیا ہے۔ اس طرح آج کا انسان مزید تنزل کی جانب رواں دواں ہے۔

ان مسائل کا وقتی حل تو یہ ہے کہ سائنسداں بلند پایہ اخلاق سے آراستہ ہوں۔ ان میں احساس ذمہ داری اور خدا کے حضور جوابدہی کا احساس جاگزیں ہو۔ ان کی تحقیقات کا مقصد انسانوں کی فلاح و کامرانی ہو نہ کہ انسانیت کی تباہی و بربادی۔

موجودہ سائنس کی بنیادی خامیاں دور کرنے کے سلسلہ میں قرآن کی مندرجہ ذیل آیات مزید روشنی فراہم کرتی ہیں۔

اولاً۔ محققین کسی جواب و نتیجہ کو سوچے بغیر (Unbiased) تحقیق شروع کریں اور اپنے تجربات و مشاہدات میں کوئی بات چھپائے بغیر اپنے خیالات کا اظہار کر دیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :۔

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ	بے شک کان، آنکھ اور دل سب
أُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا (بنی اسرائیل)	کے متعلق (اللہ کے حضور) سوال کیا جائیگا۔

ثانیاً۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے حقیقی محقق وہی ہے جو تمام تحقیقات کے بعد ایک ہی آخری نتیجہ اخذ کرتا ہے وہ ہے معرفت خداوندی یعنی کائنات کے خالق و مدبر کے وجود کا غیر متزلزل یقین اور اس کی خشیت۔

اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ	اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں
الْعُلَمَآءُ (فاطر: ۲۸)	علم رکھنے والے ہی ڈرتے ہیں۔

ثالثاً۔ قرآن ہر محقق کو ایک سوال پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ جس طرح ان تمام تحقیقات کے نتیجہ میں تم اس حقیقت تک پہنچے کہ تمام چیزوں کے وجود میں کوئی معنویت و مقصدیت (Rationality & Functionality) ہے۔ اسی طرح غور کرو کہ کائنات کا بھی کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوگا۔

زمین و آسمان کی خلقت اور لیل و نہار کی گردش پر غور کرنے والوں کے نتیجۂ غور و فکر کو قرآن انھیں کی زبان سے بایں الفاظ ادا کراتا ہے کہ۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا	اے ہمارے رب یہ سارا کارخانۂ ہست و بود
بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا	تو نے عبث نہیں بنایا تیری ذات بے عیب

عَذَابَ النَّارِ ہے پس تو ہمیں عذابِ نار (اخروی اور
(آلِ عمران: ۱۹۱) دائمی تباہی و خسران) سے بچا۔

قرآن اور سائنسِ جدید کے اس تجزیہ کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سائنس کے ان منفی رویوں اور اس کی خامیوں کو دور کرنے کے سلسلہ میں دیرپا اور مستقل حل کی بھی نشاندہی کی جائے۔

ہماری نظر میں سائنس کی یہ خامیاں اس کی تعریف (Definition) بشمول فلسفۂ سائنس اور طریقۂ کار (Scientific methods) دونوں ہی میں مضمر ہیں۔ لہذا ایک منطقی حل تو یہ ہو سکتا ہے کہ سائنس کی موجودہ تعریف میں ترمیم کر کے اس کے دائرہ کار کو غیر نامیاتی اشیاء کی تشریح تک محدود کر دیا جائے جن کا انسانی علوم اور اس کے دوسرے مسائل سے براہِ راست کوئی تعلق نہ ہو۔ مثلاً علوم طبیعیات و کیمیا وغیرہ۔ اس حالت میں بھی اخلاقیات سے صرفِ نظر نہ کی جائے کیوں کہ سائنس بہر حال ایک حقیر شعبۂ علم ہی ہے اور اس کا حامل بھی انسان ہے جس کے گوناگوں مسائل ہیں۔

دوسرا حل یہ ہو سکتا ہے کہ سائنس کو اتنا وسیع کر دیا جائے کہ اس کی حدود میں علوم عمرانیات بھی آجائیں اور معاشیات و سیاسیات بھی، مگر اس وسیع تر تعریفِ سائنس کو اختیار کرنے سے نہ صرف سائنس کی تعریف و فلسفہ ہی میں غیر معمولی تبدیلی کرنی پڑے گی بلکہ اس کے نام نہاد سائنٹفک طریقۂ کار (Scientific method) کو بھی یکسر بدلنا پڑے گا۔

ماضی میں سائنس غیر نامیاتی اشیاء کی تفصیلات و تشریحات کے علم ہی کا نام تھا۔ اس کا انسانی علوم سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ سائنس کے خیرہ کن انکشافات و ایجادات نے نیز کلیسا و عقلیت کی کشمکش کے نتیجہ میں سائنس کو خدا کا درجہ مل گیا۔ اور اب ہر شعبۂ علم کو سائنس کہنے میں فخر محسوس کیا جاتا ہے۔ لہذا عمرانی علوم کے عین سائنس ثابت کرنے والوں کو یہ بات کیسے پسند آئے گی کہ ان کی تعریف سے سائنس کا لفظ نکال دیا جائے اور ان کی تعریفات اور طریقہائے کار کو بدل دیا جائے۔

بہر حال سائنس کی مبنی بر حقیقت تعریف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان نام نہاد طریقہائے کار

میں ایسی تبدیلی کی ضرورت ہے جس میں انسان اور کائنات کو ایک اکائی کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ جہاں انسان کے لطیف احساسات و جذبات کا خیال رکھا گیا ہو۔ جس میں علم کے مادی ذرائع کے علاوہ دوسرے روحانی ذرائع کی حقیقت بھی تسلیم کی گئی ہو۔ جہاں فرد معاشرہ اور انسان و کائنات کو منتشر اور الگ انداز میں سوچنے کے بجائے کلی طور پر سوچا جائے۔ جہاں سائنس کی بنیاد انسان و کائنات کے مابین ہم آہنگی اور انسان کی پائیدار فلاح و کامرانی پر رکھی گئی ہو اور جس کا مقصد سماج کا استحصال نہ ہو بلکہ اس کی خدمت ہو۔

سائنس کی وسیع تعریف کے سلسلہ میں ایک اور اہم ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ سائنسی تجزیہ و تحقیق میں کسی کائناتی منظر کی سطحی تشریح نہ کی جائے بلکہ ان تمام عوامل بلکہ ان سے آگے بڑھ کر ان حقائق کی نشاندہی کرنے میں بھی تامل نہ ہو جن کا سائنس سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ آج سائنس کو جس علمی و فکری انقلاب کی ضرورت ہے اس سے قبل شائد کسی زمانہ میں بھی اس کی اتنی ضرورت نہ تھی۔ سائنس کے رویہ اور اس کی بنیادوں کے بارے میں اکثر مفکرین کے ذہنوں میں انقلاب آچکا ہے۔ سائنس کی مادی بنیادیں رفتہ رفتہ تنقید کا شکار ہو رہی ہیں۔ گزشتہ صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں جو سائنسی برتری کا رجحان پایا جاتا تھا وہ اب خود بڑے بڑے سائنسدانوں ہی کے ذریعہ زمیں بوس ہو رہا ہے۔ آج چند مفکرین کی نظریں اس غلط رخ کا بچشم سر مشاہدہ کر رہی ہیں۔ اگر آج بھی سائنس کی خامیوں اور کمزوریوں کے تئیں حقیقت پسندی سے کام نہ لیا گیا تو انسانیت اس موڑ پر پہنچ جائے گی جس سے واپسی ناممکن ہو گی۔

آخر میں عرض ہے کہ اگر حقیقت میں موجودہ سائنس عدم توازن کا شکار ہو گئی ہے جیسا کہ موجودہ مفکرین کا بھی خیال ہے (ملاحظہ ہو The Turning Point By Caper) تو تمام دانشوروں خصوصاً سائنسدانوں کا انسانی فرض ہو جاتا ہے کہ ایک متحدہ پلیٹ فارم سے ان خرابیوں کو دور کرنے کی مستقل اور غیر متزلزل کوشش کریں۔ انفرادی کوششوں سے اتنا بڑا کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا اس لئے کہ مسئلہ سائنس کی بنیادوں اور اس کی عمارت کی از سر نو تعمیر کا ہے۔ اس کے لئے ضرورت ہے متحد ہو کر کوئی ٹھوس فیصلہ کرنے اور اجتماعی مشوروں کے ذریعہ مثبت تعمیری کام کرنے کی سکے[۵۹]

---

۵۹ اس متحدہ پلیٹ فارم کی علی گڑھ میں بنیاد پڑ چکی ہے جس کا نام "مسلم ایسوسی ایشن فار ایڈوانسمنٹ آف سائنس" (MAAS) رکھا گیا ہے یہ کل ہند تحریک ہے احقر بھی اس کا ایک ادنیٰ کارکن ہے۔